IQBAL REVIEW (65: 3)
(July - September 2024)
ISSN: P0021-0773
ISSN: E3006-9130

فکر اقبال کا نظریاتی شعری تسلسل

ڈاکٹر صائمہ ذیشان
ریسرچ سکالر

ABSTRACT

This article explores the profound integration of philosophical, poetic, and cultural dimensions within Abdul Rahman Bazmi's literary work, particularly his poetry collection *Harf-e-Tamanna*. Bazmi is portrayed as a poet deeply influenced by Allama Iqbal's ideas, weaving Iqbal's intellectual and philosophical constructs seamlessly into his poetry. His work exemplifies the convergence of human instincts, intellectual rigor, and spiritual insights, drawing parallels with both Iqbal's philosophies and Bergson's theory of creative evolution. Bazmi's poetry is characterized by its philosophical depth, linguistic clarity, and thematic diversity. He excels in genres like *Naat* (poetry in praise of the Prophet Muhammad, (PBUH), ghazal, and nationalist verse, embedding spiritual, philosophical, and cultural aspirations into his works. His *Naat* compositions reflect not only his reverence for the Prophet (PBUH) but also a thoughtful engagement with the lessons of humanity and divine wisdom. Similarly, his ghazals resonate with classical poetic traditions, enriched with modern sensibilities and intellectual vigor. The article highlights Bazmi's dual influence: his architectural profession, which honed his sense of structure and creation, and his deep affinity with Iqbal's ideology, which shaped his poetic vision. As a diasporic poet, Bazmi

retained a strong sense of patriotism, vividly expressed in his nationalist poems that pay homage to figures like Allama Iqbal, Quaid-e-Azam, and other notable personalities. His poetry blends cultural nostalgia with contemporary relevance, offering a balanced critique of modernity while advocating for spiritual and moral renewal. Bazmi's work is positioned as a continuation of Iqbal's legacy, incorporating historical, philosophical, and religious dimensions while remaining relevant to the socio-political challenges of the contemporary world. Through his nuanced poetic expressions, Bazmi conveys messages of unity, introspection, and reconstruction, emphasizing the importance of intellectual and spiritual awakening for the progress of the Muslim Ummah.

انسانی تجربوں کے اظہار کا دائرہ، فرد کی تجرباتی استعداد سے گہرائی و گیرائی میں غور و فکر کا ایک کائناتی اصول تخلیق کرتا ہے جو اسے مادے پر دسترس عطا کرتا ہے اور جو ادنیٰ کو اعلیٰ اور اعلیٰ کو ارفع سے منسلک کرتا ہے۔ انسان کی یہی ارفعیت در حقیقت تجسّس، انہماک اور اضطراب کے متوازی خطوط پر اپنی فکری تشکیل کے مدارج طے کرتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نظریات کو شعری تسلسل سے قائم رکھنے کے ضمن میں عبدالرحمان بزمیؔ صاحب کے یہاں بھی شعری اکتشاف و بازیافت کا عمل، انسانی زندگی سے متعلق اقبالؔ کے اور برگسانی عقائد اور ارتقائیت کی ایک بامعنی مثال بن کر سامنے آتا ہے جو جبلت اور عقلِ کامل کے مشترکہ شعور سے ہم آہنگ ہو کر ہر ذی شعور کی ملکوتی بصیرت اور وجدان تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

بزمیؔ صاحب بلاشبہ پرتوِ اقبال ہیں۔ اپنے سخن پاروں کی پیش کش میں آپ نے محض فلسفیانہ نکتہ آفرینی کی تخلیق کا احساس اُجاگر نہیں کیا ہے بلکہ آپ نے اُصولِ نقد و معیارات کی مبادیات کو اس درجہ وسعت و وقعت عطا کی کہ آپ کے تنقیدی شعور نے آپ کی شعری جہات کو اقبالؒ ہی کے رجحانات کا اور ایک مسلمہ مزاج کا حامل بنا دیا ہے جو ایک تحقیقی مطالعے کی متقاضی ہیں۔ عبدالرحمن بزمیؔ صاحب پیشے کے لحاظ سے ماہر تعمیرات تھے۔ انھوں نے لندن ٹرانسپورٹ میں بطور آرکیٹکٹ ملازمت اختیار کی تھی اور اس وقت وہ اپنی عمر کا چالیس کا ہندسہ پار کر چکے تھے۔ اس سے قبل ان کا منصب، نیروبی سٹی کونسل (کینیا) میں ماہرِ تعمیرات تھا۔ تعمیرات کے شعبے میں ایک ماہر ہونے کی حیثیت سے آپ کے اسلامی عقائد اور اصنام سے متعلق آپ کے نظریات نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ کی تمناؤں، سوچوں، اعترافات اور قلم کی تمام تر خوبیاں ان کی تصنیف ''حرف تمنا' میں یکجا نظر آتی ہیں۔ آپ پیشے کے لحاظ سے ماہرِ تعمیرات تھے جو اگرچہ انجینئرنگ کا ایک علم ہے جس میں وجدان اور فلسفیانہ فکر کا عمومی طور پر کوئی کردار نہیں ہوتا، لیکن کوئی بھی علم خواہ وہ انجینئرنگ ہی کیوں نہ ہو، تحقیق کے راستوں سے گزرتا ہے اور اسی لیے آپ نے جب شعری راستے پر قدم رکھا تو ذوق و فہم کی معنویت کے ساتھ شعر کی تخلیق کے عمل پر آپ کا قادرالکلام شاعر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

بزمی صاحب کا کلام ''حرفِ تمنا'' اصناف کے اعتبار سے فکر و فلسفے کی رنگارنگی و ہمہ جہتی کی واضح علامت بن کر سامنے آیا ہے یعنی کہ انسانی جبلت کا ہر رنگ اور ہر کیفیت، جو تخلیق کی بھٹی سے گزر کر آب و تاب پیدا کرے، اس شعری مجموعے کا اختصاص ہے۔ ترتیب و ترکیب کا یہ روشن پہلو جس میں نعتِ رسول ﷺ کو اوّلیت دی گئی ہے، ذہنِ انسانی کی فکر رسا کی نہایت خوش ذوقی و نمو بندی کا اظہار

ہے۔ آپ حب رسول ﷺ میں محض جوشِ گفتار کے قائل نہیں ہیں، بلکہ ان اسباق اور علم و تعلیم کو یاد رکھتے ہیں کہ جو منشائے نبی ﷺ اور منتہائے انسانیت ہے۔

لتِ بے بصر کو بصارت ملے　　　غازیانِ سلف کی شجاعت ملے
دیدہ ور اور توانا قیادت ملے　　　ضامنِ عدل و امن و اماں آپؐ ہیں[۲]

تاثیر کی لذت اور اثر پذیری کے اعتبار سے آپ کا مذکورہ شعر، عصرِ حاضر کی واضح اور کھلی تفسیر ہے۔ دیدۂ بینا اور دور بینی کی انتہا کا عالم یہ نظر آتا ہے کہ نعت کے والہانہ پن اور عشق رسول ﷺ کے کمال کے ساتھ ساتھ آپ کے کلام میں عقل اور فکر و ہنر بھی دکھائی دیتا ہے۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ حقیقتاً اس پیغام سے رجوع کرتے ہیں جو ازل سے کلیدِ انسانیت ہے اور عشق کے پردے میں امن کا پیغام ہے۔

محمدؐ مصطفیٰ صل علیٰ، کونین کے ہادیؐ　　　ترے دامانِ رحمت ہی میں ہے جائے اماں میری[۳]

صنفِ نعت،۔ بزمی صاحب کی محض انفرادیت ہی نہیں، بلکہ جس حسنِ ظن کی متقاضی یہ صنف ہے، آپ نے اس کا حق بخوبی ادا کیا ہے اور لطفِ بیان و الفاظ کا آپ اس خوش سلیقگی سے اظہار کرتے ہیں کہ روح و دل اور ذہن تابندہ و ضیابار ہو جاتا ہے۔

مقصدِ زندگی ہے کیا؟ حق کے شعور کے بغیر　　　کسبِ ضیا محال ہے چشمۂ نور کے بغیر
یو ں تو خلا میں دُور تک جست لگا چکا بشر　　　قربِ خدا مگر کہاں! تیرے حضور کے بغیر[۴]

صَلِّ عَلٰی نَبِیِّنا صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

شمس الرحمن فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ "اقبالؔ نے اپنے بارے میں لکھا کہ زمانۂ طالب علمی میں ورڈزورتھ (William Wordsworth) کی شاعری نے انہیں دہریہ ہونے سے بچالیا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اقبالؔ نے وقتاً فوقتاً مجھے یاس اور بے مصرفی کے قعروں میں غرق ہونے سے بچالیا اور اس کی وجہ ان کا پیغام نہیں ان کی شاعری تھی۔"[۵] بزمیؔ صاحب کے یہاں بھی ان کے شعر و سخن کا کلیدی و اساسی موضوع، اقبالؔ کی شاعری سے وابستگی کا کلی اظہار (Holistic Expression) ہے۔ تاہم آپ کی اقبال سے یہ وابستگی محض شعری پسندیدگی نہیں، بلکہ اقبال کی شخصی خوبیوں اور نظریاتی پہلوؤں سے کماحقہ متاثر ہونے کی نظر آتی ہے۔ گویا آپ شعرِ اقبال اور فکرِ اقبال ہر دو کے پیہم مقلد رہے۔ اقبالؔ کی

غزلوں کی زمینیں اور اقبال ؔ ہی کے نظریات کے ساتھ آپ کے کلام میں یہ احساس، نظریے کی مضبوطی اور اظہارِ عقیدت کا فکری و اسلوبیاتی امتزاج بن کر سامنے آتا ہے کہ

تیرا مقصودِ ادب قلب و نظر کی زندگی تیرے رشحاتِ قلم شعر و سخن کی کہکشاں
"آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں" تیری شانِ آگہی اور یہ حجابِ درمیاں[۶]

بزمی ؔ صاحب کے یہاں نعت گوئی کے اظہارات ہوں یا غزل گوئی کے نمونے ہوں، ہمیشہ شاعرانہ جواہر ہی نمایاں ہوئے ہیں۔ "حرف تمنا" کے مطالعے کے دوران یہ احساس فزوں تر رہتا ہے کہ آپ نے اقبال ؔ کے کلام کی ارفعیت، عظیم الشان وسعت اور منطقی شعریات کو عقلی بنیادوں پر فہم کیا ہے اور اپنی شعریات کو اقبال ہی کے عناصرِ ترکیبی سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ اسی لیے آپ کے فکر و فلسفے میں شاعرانہ کلام کی نامیاتی لسانی تشکیل و تنظیم اور مطالعے پر اصرار ہے اور ایک طرفہ اور جانب دارانہ تفہیم و تعبیر سے صرفِ نظر کا نسخہ ہے۔ آپ نے شعوری طور پر اقبال ؔ کے کلام میں موجود مناسبتِ الفاظ اور لفظی تسلسل کو اپنی فکر و خیالات کے بامعنی اظہار کے لیے منتخب کیا ہے جو آپ کو پرتوِ اقبال کے وقیع درجے تک لے گیا ہے۔

اقبال ؔ کے کلام میں بیشتر تراکیب اور الفاظ، مستقبل اور مستقبل بعید کے الفاظ و تراکیب کی جانب اشارہ کرتے ہیں گویا اقبال کی تنقید، شعر کے نظامِ معنی کو حرکت میں رکھنے کے لیے فنی قدر کو واحد کلید تسلیم کرتی ہے۔ آپ نے بھی کلامِ اقبال ؔ کے کلیدی الفاظ کے برتاؤ کو اپنے یہاں تدریجی انداز میں بیان کیا ہے اور ممکنہ صورتوں کو مدنظر رکھا ہے۔ ایک صورت تو یہ کہ شاعر کے الفاظ اگر کسی خیال یا تاثر کو سامنے لائیں، یا فن پاروں میں شاعرانہ فکر و فلسفے کی ضرورت، فطری خطوط پر استوار ہو جو شاعرانہ الفاظ کی سادگی کی ایک مثال ہوتی ہے، یا جب کبھی ذہنی تجربے اور مشاہدے کے بیان کے لیے لفظوں کو استعاراتی معنوں میں شامل کیا جائے، ان تمام ممکنہ صورتوں میں شاعر کے الفاظ و تراکیب کسی عام معنی سے ارفع ہو کر ایک بلند تر مقام حاصل کر لیں، جب کہ ارفع ترین درجے پر شاعر کے وہ کلیدی الفاظ مستول ہوتے ہیں جو شعر، اور بعض اوقات نثر پاروں میں بھی، ایک علامتی پیرائیہ بیان اختیار کر لیتے ہیں اور متن میں موضوعیت کی کثرت سے محض اپنی معنی خیزیت میں اضافہ ہی نہیں کرتے بلکہ شاعرانہ اظہار کی قوت کو ایک وسیع و جدید کینوس بھی عطا کرتے ہیں۔

اقبال نے ارفعیت کی جانب اس مراجعت کو خورشید کے سامانِ سفر سے تعبیر کیا ہے۔ خورشید کے سامانِ سفر کے فلسفے کو ہی بروئے کار لاتے ہوئے اور اقبال ؔ کے عروض اور لفظیاتی نظام کو بھی مدنظر

رکھتے ہوئے بزمیؔ صاحب نے بھی ان ہی تنقیدی نکات اور اُصول و معیارات کو ترجیحاتی اور معنیاتی اعتبار سے جدلیاتی رویوں یعنی اُصولِ حیات و ممات کے ذریعے اپنے کلام میں ظاہر کیا ہے کہ جس میں ناموجود اور غیاب کی علامت بھی موجود ہے اور سر خوشی، حیات آوری اور احساسِ تحفظ کا استعارہ بھی ظاہر ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ کی نظموں میں کلام اقبال کے عنوانات کا استعمال برجستگی کے ساتھ ہوا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کلام اقبال کی معنویت ہی نہیں بلکہ اقبال کی کتابوں کے ناموں میں جو تمہید، معنویت اور رمزیت موجود ہے، وہ بھی اپنی تمام تر خوبیوں اور معنویت، ہر دو کے ساتھ آپ کی نگاہوں میں کشادہ ہے۔ یہ اس بات کا ثبوتِ واقعی ہے کہ جو نظریۂ اقبال اور فکر اقبال کی بسیط و عمیق معنوں تک پہنچا ہو، وہی ان اشعار کا خالق ہو سکتا ہے۔

السلام اے شارحِ اَسرارِ فرقان حمید — ہے تری "بانگِ درا" بیداریِ دل کی نوید
السلام اے ملتِ اسلام کے بطلِ جلیل — علم و دانش کا صحیفہ تیری "بالِ جبرئیل"

بیسویں صدی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی صدی تھی کہ فن کار کی قبولیت (Legitimizing the Artist) سے مراجعت[۸] کرنے کے بعد حضرتِ انساں کے ساتھ ساتھ علوم و فنون اور ادبی قدروں میں بھی جدیدیت (Modernism) کے مظاہرات سامنے آئیں گے اور اس کے پس منظر میں انیسویں صدی کی عقلیت کا فلسفہ بہ طور محرک موجود رہے گا۔ بزمی صاحب کے شعری رجحان میں ایک تحرک اور تدریجی ارتقا کی یہی جدید شکل روشن افروز ہے کہ جس کے سبب سے آپ کی شاعرانہ بصیرت میں ارتکاز، ہمہ گیریت، آگاہیِ مقصد اور تجزیے کا احساس ایک ذہنی و فکری روابط کے ساتھ ملتا ہے۔

برگسانی ارتقائیت کی عمارت منطقی استدلال اور صداقتوں کی بنیاد پر اپنے نقطہ ہائے نظر کو بیان کرنے کی شرائط پر قائم تھی اور خود برگساں نے حرکت کو زندگی قرار دیتے ہوئے قوۃ الخلق (E´lan Vital) کو زندگی کی ایک ہمہ گیر تحریک کا نام دیا تھا۔[۹] اس کی تصنیف "تخلیقی ارتقا" (Creative Evolution) کا مطالعہ جب امریکی مفکر ولیم جیمز (William James) نے کیا تو اس کے مطالعہ کلام کا حاصل یہی تھا کہ اس میں اس قدر نئی باتیں ہیں کہ برگساں کے ہم عصروں اور بعد کے آنے والوں کو انھیں اپنانے کے لیے ایک طویل مدت درکار ہوگی۔ کلامِ اقبالؔ بھی نئی فکریات سے معمور تھی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ پرتوِ اقبالؔ کے علم بردار بزمیؔ صاحب کی شعریات میں بھی نئے اور جدیدیت کے تین عناصر، یعنی ثبوتی، تعمیری اور انسانی، شعور کی حمایت بیش از بیش شامل رہے اور جو حقیقت کو حرکی، تخلیقی

اور روحانی مراتب عطا کرتے ہیں تاہم اقبالؔ کے فکر و فلسفوں سے خوشہ چینی کی باوجود آپ کی شعریت میں کہیں بھی مہمل (Intertwined) ہونے کا احساس قطعی موجود نہیں ہے۔

اقبالؔ کا مسلک، جنوں کے ساتھ گریباں کی حفاظت بھی تھا کہ در حقیقت عشق و عقل کا امتزاج ہی فطرت کی رعنائی کو اجاگر کرتا ہے اور انسانی فکر کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے یعنی وہ انسلا کی ربط جو حقیقت و گمان دونوں کا بخوبی ادراک رکھے۔ اقبالؔ کے یہاں یہ انداز مذہبی فکر کو ندائیہ انداز میں پیش کش کا روپ عطا کرتا ہے لیکن الجھنوں سے کامل مبرا اور ابہام کی کوئی ایک لہر بھی دل و دماغ کی جانب سفر نہیں کرتی۔ یہ دراصل خیالات کے واضح ہونے اور فکر کی مضبوطی کی دلیل ہے۔ بزمیؔ صاحب نے اقبال کے مسلک کو مقدم جانتے ہوئے ایسے کلام پیش کیے ہیں کہ یہ خوبیاں خود ان کے کلام میں وجدانی، فطری اور وہبی معلوم ہوتی ہیں۔

تیرے ارشادات کا ہر لفظ ہے مجھ کو قبول — تیرا فکر و فہم تھا پروردۂ عشق رسول ﷺ

تیرے افکارِ حسیں میں زیست کا پیغام ہے — تیرا اک اک شعر گویا پارۂ الہام ہے

شاعری کی پستیوں کو تو نے بالا کر دیا — علم و حکمت سے دماغوں میں اُجالا کر دیا"

اگرچہ بزمیؔ صاحب نے اقبالؔ کو کمال خراجِ عقیدت پیش کیا ہے مگر لفظوں کا انتخاب اور خیال کی رعنائی، تصورِ اقبال کے علاوہ خود آپ کے اہلِ نظر ہونے کی بھی علامت ہے۔ انسان کی فکر و نظر کی تخلیق کا اصل محرک، اندرونی روحانی جذبہ ہوتا ہے جس کو سمجھنے سے حیاتیاتی مظاہرات سامنے آتے ہیں۔ بسا اوقات یہ قلم کے ذریعے اجاگر ہوتے ہیں جس کی پیش کش میں زبان کے جدید نظریات میں لسانیات کا ساختیاتی نظام حد درجہ اہمیت رکھتا ہے۔ ساختیاتی فکر کی پہچان یہ ہے کہ زبان کا مسئلہ، فکرِ انسانی کا خاص مسئلہ ہے یا زبان کا نظریاتی مسئلہ دوسرے تمام مسائل پر فوقیت رکھتا ہے۔" زبان کو تصور قرار دینے میں زبان کا اپنا وہ مزاج ہے جو حقیقت کو صاف دکھانے پر مصر ہوتا ہے۔ اقبالؔ کے بارے میں بالعموم اور ان کے ڈکشن کے بارے میں بالخصوص فاروقی صاحب کا یہ کہنا کہ "اس شخص (اقبالؔ) کو کسی بھی غیر معمولی یا غیر فطری یا ما فوق الفطری طاقت یا قوت یا ہستی سے خطاب کرنے میں جھجک نہیں ہوتی۔ وہ برابر کی گفتگو ان سے کرتا ہے، چاہے وہ شمع سے شاعر کی بات ہو رہی ہو، چاہے وہ ساحل و دریا پر خضر سے یہ پھر وہی فکری معاملہ ہے کہ اس شخص کو کوئی حجاب نہیں ہے، خفتگانِ خاک سے بھی بات کر لیتا ہے، جگنو سے بھی بات کر لیتا ہے اور پہاڑ سے بھی، اور پیغمبر سے بھی بات کر لیتا ہے، وہ اسی لیے کہ اس کے یہاں یہ سب ایک نظامِ حیات ہے جس میں ایک ہی روح دوڑ رہی ہے، اور یہی چیز اقبال کے

کلام کو ایک غیر معمولی وسعت اور پہنائی عطا کرتی ہے۔"[۲] بزمیؔ صاحب کے یہاں بھی یہی ڈکشن اکتسابی اور غیر شعوری طور پر ساختیاتی اعتبار سے اپنے عروج پر نظر آتی ہے کیوں کہ اس میں بیان کی طاقت، تصور کے پہلو بہ پہلو چلتی ہے۔ اسی ڈکشن کی جلوہ نمائی کے سبب آپ کے یہاں اشعار اپنی ہستی میں شعلہ نوائی پیدا کرتے ہیں۔

مرے اشعار میں اقبالؒ کا رنگِ پیام آیا　　مرے افکار پر ہے سایہ گستر فکرِ قرآنی[۳]

مذکورہ شعر مذہبی لبادے میں ملفوف ہونے کے باوصف ایک ادبی مظہر ہے اور بقول ناصر عباس نیر[۴] " ادبی متن، مذہبی متن کے برعکس، انسانی تخلیق ہے، اور اپنی نہاد میں بقول ایڈورڈ سعید 'دنیویت' (Worldliness) کی اساسی خصوصیت رکھتا ہے جو حسیاتی خصوصیت اور تاریخی امکانیت سے عبارت ہے۔"[۵] انسانی تخلیقیت کی یہ رو آپ کے یہاں وطنیت کے جذبے کو بھی سرشار و توانا رکھتی ہے۔ اگرچہ بزمی صاحب کی ساری زندگی دیارِ غیر میں گزری لیکن پاکستانیت کا احساس آپ کے قلم کے ذریعے صفحۂ قرطاس پر بکھرا رہا، حالاں کہ جدید تمدن کا نظریہ، انسانی آسائشات کو اولیت دیتا ہے جہاں وطنیت کا جذبہ ایک سنجیدہ احساس بننے کے بجائے محض ایک رومانی تصور بن کر رہ جاتا ہے اور وطن سے محبت محض ناسٹل جیا کے ایک جذباتی فقرے کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ تاہم آپ کے کلام میں وطنیت کا جذبہ ایک سنجیدہ احساس کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور آپ کے یہاں تصورِ بانی پاکستان کی محبت سے ارضِ پاک کی محبت کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ آپ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے غالب احساس یہی ہوتا ہے کہ آپ پاکستان کی روحانی برادری اور جذبہ حب الوطنی کے رشتے سے اپنے آپ کو منسلک پاتے ہیں اور پاکستان سے الفت کا اظہار کرتے ہیں۔ قائد اعظمؒ کے نام اپنی نظم "اے قائد اعظمؒ" کے یہ چند اشعار اس بات کا ثبوت ہیں۔

منزل یہ ملی ظلم کے طوفاں سے گزر کر　　مکاریِ ابلیس کے طغیاں سے گزر کر
پُرپیچ رہِ گردشِ دوراں سے گزر کر　　ہر مرحلۂ فکرِ دل و جاں سے گزر کر
ملت کو کیا پاک وطن تو نے فراہم　　اے قائدِ اعظم[۶]

سر زمین پاکستان کے لیے کہی جانے والی نظم، آپ کے کلام میں وطنِ عزیز کو محبوب کی صورت عطا کرتی ہے جیسا ہمیں فیضؔ کے کلام میں بھی نظر آتا ہے۔ شاعری ایک ایسا حساس قطب نما ہوتا ہے جو اپنے قومی جذبات کی ہر سمت میں سچی نشان دہی کرتا ہے۔ بزم صاحب کے شاعرانہ خطاب کا یہ آہنگ ایک باوقار مملکت سے اظہارِ عقیدت ہے۔

اے وطن! قائد اعظم کے مقاصد کے زمیں　　خوابِ اقبال کی تعبیرِ دل آویز و حسیں
تیری مٹی سے فروزاں ہے عقیدت کی جبیں　　تو کہ ہے خونِ شہیداں کے تقدس کا امیں
تیری تشکیل کا جب ہم نے کیا عزمِ صمیم　　ہوگیا تازہ پھر افسانۂ فرعون و کلیمؑ
اک طرف قوتِ طاغوت تھی ہمراہِ غنیم　　دوسری سمت فقط جذبۂ ایثارِ عمیم[۱۷]

اردو شاعری میں شخصیات کو موضوع بنانے کی روایت ابتدا ہی سے رہی ہے۔ شعرا قصائد کی شکل میں قادر الکلامی کی داد کے ساتھ ساتھ معیشت کے سہارے بھی پاتے تھے۔ قصائد، انفرادی شخصی تعریف کے خوشامدانہ نمونے ہوتے تھے، لہٰذا قصائد میں فنی رچاؤ کے علاوہ اجتماعی جذبات یا سودمندی کے اثرات بالکل نہ تھے۔ تاہم قیام پاکستان کے بعد اجتماعی رجحانات کے سبب قومی وملی شخصیات کو خراج عقیدت پیش کرنے کا جذبہ پروان چڑھا جو خوشامد اور مطلب برآری سے پاک تھا۔ بزمی صاحب کے یہاں اقبالؒ اور قائد اعظمؒ جیسے مسلمہ فکری رہنماؤں کے خراجِ عقیدت کے علاوہ دیگر شخصیات کے اظہارِ تحسین کے نمونے بھی ملتے ہیں جس سے خود آپ کی شخصیت کی مضبوطی اور فکری بلاغت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ شخصیت کی جزئیات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کی بنائی ہوئی قلمی تصویریں قلمی آب و رنگ رکھتی ہیں۔

نہیں ہے انتہائے شوق بزمیؔ　　مگر حرفِ تمنا مختصر ہے[۱۸]

بزمیؔ صاحب اگرچہ کثیر الکلام شاعر نہیں مگر شاعرانہ صفات سے ہمہ صفت متصف ہیں۔ متفرقات کی صورت میں جستہ جستہ اشعار، آپ کی قادر الکلامی کی دلیل ہیں۔ آپ کے یہاں فن کا اظہار کامل طور پر نظر آتا ہے۔ لفظوں کا انتخاب، اسلوبِ بیان (Diction)، کلاسیکی رچاؤ اور سب سے بڑھ کر مضبوط و مسلمہ فکری عناصر، یہ تمام محاسن کلام آپ کے اشعار کو بقائے دوام بخشتے ہیں۔ طوالتِ کلام سے بچ کر بقائے دوام حاصل کرنے کا نسخۂ کیمیا وہ خود اپنے اشعار میں کہہ گئے کہ

بے سبب طول بیانی کی ضرورت کیا ہو　　شعر تو ایک بھی کافی ہے مگر شعر تو ہو[۱۹]

آپ کے یہاں شخصیت کے اظہار میں ایک باکمال و وسیع المطالعہ شاعر کا احساس پہلو بہ پہلو موجود رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کے یہاں نظم نگاری و غزل گوئی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ایسے شعرائے کرام نایاب رہے ہیں جو بیک وقت دونوں اصناف میں قادر الکلامی کے جوہر سے معمور و مزین ہوں۔ آپ کی نظم نگاری اور غزل گوئی کے الگ الگ امتیازات اپنی معنیاتی ساخت میں

خیالی (Imaginary)اور موضوعاتی (Thematic) نشوونما کی شان کے ساتھ موجود نظر آتے ہیں۔ "حرف تمنا" میں حفیظ الرحمن احسن صاحب نے آپ کے کلام کے بارے میں اپنی رائے، بہ عنوان ''حرفِ تمنا کا شاعر''، کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جہاں کوئی نظم تفصیل و اطناب چاہتی ہے وہاں غزل کا جوہر اس کی ایمائیت اور بلاغت میں مضمر ہے۔

بزمی صاحب کے متن میں شاعر کے فن کے یک رُخے پن اور اس کی شخصیت پر گزرنے والی واردات کے بیان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اپنی توجہ اس بات پر مرکوز رکھتے ہیں کہ متون کا عملی رویہ کیا ہے کہ جس کی بنا پر شعر اس فصاحت و بلاغت کی منزل سے ہم کنار ہوتا ہوا قاری کے شعور تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ آپ کا یہ شعری طرزِ عمل اس حقیقت کو پایہ ثبوت عطا کرتا ہے کہ آپ نے کلامِ اقبالؒ کی تفہیم میں شعریات کے مشرقی رجحان و رویوں کو اوّلیت بھی دی ہے اور اُن میں موجود کثیر المعنویت کی موجودگی کی دریافت کے لیے جدید اور مابعد جدید نظریات کے بنیادی نکات کے بھی آپ کسی مرعوبیت کے بغیر قائل و متفق نظر آتے ہیں اور ان ہی خدوخال کو اپنے شعری متن کا حصہ بناتے ہیں۔

فاروقی صاحب نے ای- ڈی -ہریش(E.D. Harisch) کے اس نظریۂ ادب کا اعادہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ "نظریہ ادب کے بغیر کسی فن پارے کے ظاہری اور ہیئتی خواص کا بھی بیان ممکن نہیں، چہ جائے کہ اس کے ظاہری صفات اور اس کے فنی اقداری پہلوؤں پر اظہار خیال یا تنقید ممکن ہو۔"[۲۰] ان الفاظ سے ادبی تنقید کی ایک کلید سامنے آتی ہے کہ نظریات و شعریات کو متن کی قدر (Value) کی وضاحت کے لیے لازم خیال کیا جائے۔ بزمیؔ صاحب نے بھی اقبالؒ کے کلام کے ادبی متون کی صریح اور یقینی جواہر کو شعور اور ماورائے شعور ہر دو سطحوں پر اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے، مثلاً آپ کے یہاں اس حقیقت کا ادراک ملتا ہے کہ بعینہ اقبالؒ کے انداز میں غزل کو مقصدِ عمل کے لیے ذریعہ ابلاغ بنایا جاسکتا ہے۔ اسی سبب سے نسبتاً تعداد میں کم غزلیں لکھ کر بھی غزل گوئی کے تمام تر فنی تقاضوں کی تکمیل آپ کے پختہ ادبی شعور کی دلیل ہے۔ مثلاً آپ کی درج ذیل غزل کے ان اشعار میں لطفِ بیان، روانی اور خیالات کے تسلسل نے آپ کے کلام میں بلاشبہ کلاسیکی شاعری کا سارچاؤ پیدا کر دیا ہے کہ

کوتاہ بیں کی بات ہو یا دیدہ ور کی بات — ہے اپنی اپنی وسعتِ فکر و نظر کی بات
اہل ہوس کی بات سے مجھ کو غرض نہیں — سرمایۂ حیات ہے اہلِ نظر کی بات
اتنا نہیں ہے ذکرِ سحر اُن کو ناگوار — جتنی ہے ناگوار اذانِ سحر کی بات

بزمیؔ کسی کی دیدہ وری کا یہ فیض ہے چچتی نہیں نظر میں کسی کم نظر کی بات[21]

آپ اپنے شعری رویوں میں ثقافتی مظاہرات کے قدامت پسند یا دقیانوسی خیالات (Old Stereotypes) کو رد بھی کرتے ہیں اور نئے منظر ناموں (New Media) کو اپنے کلام میں شمولیت بھی دیتے ہیں۔ اقبالؔ کا ذہن تاریخیت کے شعور سے لبریز تھا اور کلامِ اقبالؔ میں تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ تاریخ کا ایک مکمل تصور بھی موجود ہے، جیسا کہ ایک شعر کی مثال یہ ہے کہ

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم نہایت اس کی حسینؓ، ابتدا ہے اسمعیلؑ[22]

اقبالؔ بھی شناخت کے اس سلسلے تک پہنچنا چاہتے تھے جہاں پر وہ منقطع ہوا تھا اور ایک بحرانی دور کا آغاز ہوا تھا۔ چوں کہ اقبال راست کسی صنعتی یا سائنسی تجربے سے نہیں گزرے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں قومیت کے عدم تسلسل کا تجربہ بھی شعوری اور جمالیاتی ہے۔ سیاق ہو، متن ہو، یا پس منظر و پیش منظر، اقبالؔ کے یہاں یہ دو یا دو سے زیادہ معانی فراہم کرتے ہیں جس میں ایک مخصوص مستقبل کی خاطر ماضی کے حوالے اور تناظر کو بیان کیا جاسکتا ہے۔ بزمیؔ صاحب اس پر بھی متفق نظر آتے ہیں کہ کوئی بھی فن پارہ خود مکتفی ہوتا ہے اور اس کا مقصدِ واحد، انسان کی تحلیلِ نفسی ہی نہیں بلکہ سیاسی و سماجی اہمیت کا احساس و ادراک اور تاریخ کو محفوظ کرنے کی خواہش بھی ہوتی ہے۔ آپ راست صنعتی تجربے اور ہجرت کے عمل سے گزرے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ شناخت کے عمل کے حصول میں اقبالؔ کے ساتھ اس ذہنی و معنوی ثنویت کا ثبوت بھی دیتے ہیں جسے اقبالؔ نے اپنی فکری مرکزیت کے سبب بیان کیا ہے اور اقبال کے بعد آپ نے پرتوِ اقبال کا حق ادا کیا ہے۔ "بہ تقریب یوم اقبال ۱۹۸۰ء" کے موقع پر آپ کی غزل، اقبالؔ ہی کے کلام کا سا لطف دیتی ہے۔ اگرچہ غزل کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ یہ مقاصد کے استعمال کے لیے کچھ موزوں خیال نہیں کی جاتی ہے اور بارہ سے پندرہ اشعار میں ایک ہی نفسِ مضمون کا بیان، دشتِ خیال میں تھوڑا کٹھن گزرتا ہے لیکن کیا کہیے کہ آپ کے یہاں یہ احساس بالکل نہیں ملتا کہ غزل کو کسی مقصد کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ مذکورہ غزل میں جہاں اقبالؔ کی عقیدت کا احساس نمایاں تر ہے وہیں آپ کے ذاتی شعور کی افزودگی اور تاریخ کے ہشت پہلوی معنویت کا احساس موجود ہے۔

نہ کمالِ شعر گوئی نہ مذاقِ نَے نوازی نہ وہ غزنوی مقدر، نہ طبیعتِ ایازی
ہے نظر نظر میں پنہاں تیری دلبری کا جادو رگ و پے میں بس گیا ہے تیرا سوزِ نَے نوازی
یہ جنونِ عشق کیا ہے! مرا جذبۂ حقیقی وہ فسونِ عقل لیکن، تیرا پردۂ مجازی

مرا حسنِ شاعری کیا، مری خوبیِ نظر کیا یہ تری سخن شناسی، وہ تری نظر نوازی[۲۳]

یے ٹس (Yeats) کے نظریۂ آتمن (Self) اور اقبال کا نظریۂ خودی دراصل ایک ہی کلیدی تصور کی شکل ہے اور یے ٹس کے یہاں خودی، تخیل، ارادہ، عمل، عرفان اور تقلیبِ خود (Self Transformation) وغیرہ کے نظریات کی مماثلت میں اقبال نے بھی یہی کہا تھا کہ

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش
حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر ایک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش[۲۴]

اقبال کے اشعار اور فلسفوں کی تشریح و توضیح اپنی شعریات میں جس عالمانہ طرز پر آپ نے کی ہے، اس سے ایک قائم مشترکہ فکری نظریے کی مکمل وضاحت ہوتی ہے کہ ایک ارتقا پذیر متحرک کائنات میں جمودی مشاہد، وقت، حرکت، خلا اور جمود کو خود اقبال نے اور دیگر مفکرین نے ایک ہی ریاضیاتی تخیل کے تحت ترتیب دیا ہے اور چوں کہ حرکت اس کا اساسی جز ہے، اس لیے کائنات کے ہر نظام میں دخیل و کارگر ہے۔ اگرچہ زمان کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے لیکن مادی اشیا کے لیے وقت، آسمانوں کی گردش سے پیدا ہوتا ہے اور اسے ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت کی نوعیت ایسی ہے کہ جب تک ایک دن ختم نہیں ہو جاتا، دوسرا دن شروع نہیں ہوتا، لیکن وقت کا بہاؤ ایسا ہے کہ جو مدت مادی ہستی کے لیے ایک دن کی ہے، وہ غیر مادی ہستی کے لیے ایک دن سے زیادہ نہیں، اور اسی ذوقِ پرواز کے مدارج طے کر کے انسان اس "ربانی وقت" یا "الٰہی وقت" تک پہنچتا ہے جو گزرنے سے مبرا اور دوام سے بھی بالاتر ہے، جو نہ آغاز پر منتج ہوتا ہے اور نہ انجام پر۔ یہی تو "ساقی نامہ" میں بھی اقبال کہتے ہیں۔

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی[۲۵]

اقبال کے مسلمہ و متفقہ نظریات اور آئیڈیالوجیکل اشکال کو سمجھنے کے لیے سماجی، تاریخی اور ثقافتی نشانات کی اہمیت و معنویت کو تسلیم بھی کرنا ہوگا اور شعر گوئی کو رسومیات کا پابند قرار دے کر اس نظریے کو وثوق کے درجے تک رسائی بھی دینا لازم ہے کہ رسومیات کی اکائیاں ہی درحقیقت تخلیقِ فن اور نظریۂ فن کی بیانیہ ساخت میں حصے دار ہوتی ہیں۔ رسومیات کی اکائیوں کی وضاحت اگر ان الفاظ میں

کی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعر یا تخلیق کار کی طبیعت اور اشیائے کائنات میں ایک ہم آہنگی کی جو صورت دکھائی دیتی ہے اور جسے برگساں نے روحِ حیات (Vitality of Life) کا نام دیا ہے۔ اقبال کے کلام میں غیر معمولی یا ما فوق الفطری طاقت یا قوت یا ہستی سے خطاب کرنے والے ان اشعار کے مطالعے سے یہ احساس ایک بار پھر ابھر کر سامنے آتا ہے کہ روحِ حیات یا ذوقِ پرواز ہی زندگی حقیقی و صریح معنی ہیں۔ بزمی صاحب کا جدید ذہن اپنی عقل پسند شعور کی بنیاد پر اور کیا، کب، کیوں، کہاں اور کیسے کے حامل سوالات اٹھانے کے لیے اقبال کے تعقل اور معروضیت میں ربط پیدا کر کے نئے شعور و فکر کی بنیاد رکھتا ہے، لہٰذا آپ کی فکری قوت میں بھی خود آپ کی شخصیت کی مرکزی علامت جہد و عمل اور سعی و جستجو کی نشانیات مرتسم ہیں۔ فکرِ اقبال ہی نہیں، زمینِ اقبال میں بھی آپ کا رنگِ تغزل خوب نمایاں ہے۔

"ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں" جبینِ عاجزی اس مصرعِ اقبال پر خم ہے
چھپائے پھرتے ہیں اپنے بتوں کو آستینوں میں وہ اَوروں کے بتوں کو توڑتے ہیں بت شکن بن کر
ہو کوئی نکتہ چینوں میں کہ معنی آفرینوں میں[۲۶] جہاں جائیں گے پیمانِ وفا دہرائے جائیں گے

گویا مصرعِ طرح کے استعمال کے باوجود شاعرانہ احساس جو کہ آپ کی شخصیت پر روشنی ڈالتا ہے جو تخلیقی سطح پر شاعرِ خود کمال کی تخلیق کا ہنر ہے۔

بطور ماہر تعمیرات، آپ تعمیر اور تخریب کا فرق بخوبی سمجھتے تھے۔

تخریب کو بھولے سے بھی تعمیر نہ کہنا[۲۷] ظلمت کو کسی حال میں تنویر نہ کہنا

وہ اس بات کا بھی ادراک رکھتے تھے کہ نائن الیون کے افسوس ناک واقعے کے بعد ترقی یافتہ معاشروں کے ناقدین اس المناک حادثے کا تعلق مذہبی عقائد سے جوڑیں گے جب کہ ترقی پذیر معاشروں کے ناقدین دو عالمی جنگوں کے درمیان بین الاقوامی تعلقات[۲۸] کے حقائق سے صرف نظر کر کے اسے امریکا کی حاکمیت پر بیعت کرنے کی سعادت حاصل کرنے میں تساہل کا مظاہرہ[۲۹] قرار دیں گے۔ تاہم آپ کے یہاں ایک متوازن نظریہ سامنے آتا ہے کہ "اسلام" اور "تخریب" دو متضاد عمل ہیں۔ آپ اپنے اشعار میں منطق و دلیل سے کام لینے اور تخریب کی تردید کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا قلم ملت اسلامیہ کی زبوں حالی پر نئی تعمیر کا درس دیتا نظر آتا ہے۔ اقبال کی فکر کی جدیدیت نے انھیں یہ سکھایا کہ ادیب سے کسی پابندی کا اصرار نہ کیا جائے اور اس نقطہ نظر کو ہی انھوں نے کلام اقبال و خطبات اقبال کی تفہیم و تشریح کی ساعت میں خود پر طاری رکھا۔

"حرفِ تمنا" کو اگر تمنا کے معنوں میں مطالعہ کیا جائے گا تو گستاف فلابیر (Gustave Flaubert)، مارسل پروست(Marcel Proust)، فٹزجیر الڈ(F. Scott Fitzgerald) اور آرتھر ملر(Arthur Miller) کی تمنا[30] کے مقابلے میں بزمی صاحب کی تمنا واضح ہے اور آپ بھی اس پر متفق رہے کہ شاعر اپنے شعری رویوں اور نظریات میں اس طرح ہو کہ جیسے کائنات میں خدا، کہ اس عمل دخل ہر جگہ ہو لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دے۔ شعرائے کرام اپنی شاعری میں " وہ قوتیں شامل کرتے ہیں جو تصوراتی اور جذباتی تفریقات کا احاطہ کر سکیں اور تجربات کی کثرت کے ذریعے شعرا حضرات ہمیں یہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیتے ہیں کہ آخر انسان ہے کیا؟ کیا وہ واقعی مجموعہ اضداد ہے، اس لیے ناقص اور خام ہے، یا پھر وہ ایسے ماحول میں ڈال دیا گیا جہاں نہ خارج میں وحدت ہے اور نہ باطن میں وحدت ہے۔[31] " آپ نے اپنے کلام میں اقبالؒ کے عقلی و فکری دلائل و براہین اور علمی سچائی کو مد نظر رکھتے ہوئے حقیقت کی تلاش و جستجو کی سعیِ پیہم کی ہے۔ "حرف تمنا" میں شامل "زمزمۂ نعت"، "نذرِ اقبال"، "پاکستانیات" اور " سلکِ جواہر" میں بزمیؔ صاحب کا معماری قلم ہمیشہ ملت اسلامیہ کی عالمی قوانین کے عین مطابق تعمیر نو کا درس دیتا ہے اور دنیا کی تباہی کے کسی بھی واقعے کو منگولی و چنگیزی سطح پر مطالعہ کرتا ہے۔ اس پیرایے میں آپ کا بالکل واضح نظریہ یہی ہے کہ تعمیر نو سے قبل مکاریِ ابلیس کو پہچانا جائے اور ظلم کے طوفان کو اسی طرح سمجھا جائے جیسے آزادیِ پاکستان کے لیے سمجھا گیا تھا۔ یہ ابلیس اور اس کے پجاری ہی تھے جنھوں نے ایک طویل عرصہ تک ایشیا اور افریقا کو اصنام پرستی، جاہ پرستی اور شدت پسندی میں مبتلا کیے رکھا اور ان اقوام کو اپنے قدموں تلے روندتے رہے۔

منزل یہ ملی ظلم کے طوفاں سے گزر کر　　مکاریِ ابلیس کے طغیاں سے گزر کر[32]

اسی قسم کی فکر فیضؔ کے یہاں بھی نظر آتی ہے، گویا بزمی صاحب کے نظریات کو اقبالؔ اور فیضؔ کے فلسفے کے تناظر میں مطالعہ کرنا ہوگا۔

زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے، درد کی انجمن جو مرا دیس ہے
کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام، کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام
پوسٹ مینوں کے نام، تانگے والوں کے نام، ریل بانوں کے نام
کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام
بادشاہِ جہاں، والیِ ماسوا، نائب اللہ فی الارض۔۔۔ دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکالے گئے ہیں، جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھالے گئے ہیں

ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی ہے
دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے
جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے، دھجیاں ہو گئی ہے
ان دکھی ماؤں کے نام، رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں اور
نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں میں سنبھلتے نہیں
دکھ بتاتے نہیں، منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں [۳۳]

معاشرت کو شعریت یا شعرا پر فوقیت دینے کا عمل بیک وقت جدید معاصر علمیات اور مختلف نظریاتی مباحث سے جدلیاتی سطح پر قائم رہتا ہے اور ادبی متون کی مقامیت بھی اپنی پیش کش کے لیے ان مروج مسائل سے نبرد آزما رہتی ہے۔ بزمیؔ صاحب نے بھی شعری رجحانات و بیانات کو محض سیاق و سباق کی ترتیب کا ذمہ دار قرار دیا ہے اور جہاں تک متن کا تعلق ہے، ان کے نزدیک متن کا اپنا مزاج ہی تعبیر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے، لہٰذا ناقد، متن سے ہر اُس معنی کی یافت و دریافت کا مجاز ہے جو فی الواقع متن میں موجود ہوں یا ان کی ممکنہ موجودگی سے اسے واقفیت ہو۔ اس ضمن میں آپ نے کلامِ اقبال کے کلاسیک شعری متون کی تفہیم و تعبیر میں منشائے تخلیق کار (Unique Privilege) کو سرسری نہیں جانا ہے کیوں کہ اقبالؔ کے یہاں یہ طرزِ عمل کثیر المعنویت کے مقاصد سے مکمل کر اتفاق کرتا ہے اور یوں متن کی توقیر میں اضافیت (Relativity) کا سبب ہے، اور اس پیش کش میں متن کی قدر و قیمت میں وسعت، داخلی گہرائی، ثقافتی تہ داری اور اضافہ بہر صورت ممکن و لازم ہے۔ ان ہی اسباب کی تکمیل پذیری میں آپ نے ہمیشہ آمدِ سحر کا درس دیا ہے، نہ کہ ایسی صبح کا جو گرتی ہوئی عمارتوں سے اٹھنے والے دھویں اور اس کے پس منظر میں چیختی چلاتی انسانی آوازوں کے کرب کے کیکٹس لیے نمودار ہو۔ مکاریِ ابلیس کو پہچاننا اور ظلم کے طوفان کو سمجھنا' آپ کا وہ منفرد نظریہ ہے جو ملت اسلامیہ کے دوبارہ عروج کے خواہش مند شعرا کے کلام میں نایاب ہے۔ آپ کا یہ اچھوتا نظریہ مکمل طور پر معروضی اصولوں پر قائم ہے۔ آپ ماہر تعمیرات (Architect) تھے اسی لیے تعمیر نو (Rehabilitation) کی باریکیوں اور اس کے اسرار و رموز سے بخوبی واقف تھے۔ جدید دور کے تقاضوں کے عین مطابق ان کے نظریے کو سمجھنے کے لیے ان ہی کا درج ذیل شعر ان کے نظریات کا عکاس ہے۔

جب بھی ملتا ہے کسی سازشِ پنہاں کا سراغ   ایک انگلی کا نشاں اس میں ضرور آتا ہے [۳۴]

علم کی فیض رسانی یعنی اس کے اظہار میں توضیحی تفصیل، مبنی بر حقیقت گوشوارے (Real Data) اور معنویت کے ساتھ ربط و آراستگی در حقیقت تخلیقی جوہر کی معجز نمائی ہے۔ ادب و شعر کے مطالعات انسانی اذہان کو لطف و اطمینان سے بھی آگے علم و فہم کی منازل تک رسائی دیتے ہیں۔ جہاں ایک طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپ نے جہاں نہایت معروف شخصیات کو موضوع سخن بنایا ہے، وہیں ان قد آور شخصیات کو بھی موضوع سخن بنایا ہے جن کے بارے میں اس سے قبل شعر گوئی نہیں کی گئی تھی۔ آپ نے ان شخصیات کے بارے میں بھی اپنے اظہارِ خیال کو محبت کے جذبے سے گوندھ دیا ہے۔ ابو الاثر حفیظ جالندھری، مولانا نصر اللہ خان عزیز، جناب عبد الرشید فاضل، سید حسن مثنی ندوی، جناب فضل حق اثر لدھیانوی، جنرل حمید گل، اعجاز رحمانی اور مشتاق یوسفی وغیرہ کے نام اس ضمن میں لیے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر "حرف تمنا" میں ابو الاثر حفیظ جالندھری پر آپ کے اشعار عقیدت و محبت سے لبریز ہونے کے ساتھ ساتھ وضاحت کے انداز میں حفیظ صاحب کی شاعری کے اسرار بھی قاری پر منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اے کہ تُو ہے صاحبِ "شہنامۂ اسلام" بھی　　شاعرِ شعر و ترنم ، صاحبِ پیغام بھی [۳۵]

مشتاق یوسفی صاحب کے منصب کو بیان کرتے ہوئے اس معاشرت پر آپ کے فطری مزاح کے غلبے اور تسلط کے لیے وثوق کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔

اس دورِ کرب ناک میں مشتاق یوسفی　　صرصر کی رَو میں ابرِ بہاراں لیے ہوئے [۳۶]

"حرفِ تمنا" کا انتساب "ملت اسلامیہ کے نام" ہے۔ آپ ملت اسلامیہ کو ایک خاندان سمجھتے تھے اور ارضی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اس خاندان کی بقا اور سربلندی کے خواہش مند تھے۔ گویا آپ کی تصنیف کا انتساب بھی آپ کے خیالات، عقائد اور نظریات کے عین مطابق ہے۔

یہ سچ ہے کہ ادیب تنہا یا غیر وابستہ نہیں ہو سکتا۔ فرسودہ و جبری مسلّمات کے رد میں نئی تعمیر و تشکیل کا اکتسابی رویہ اور بے بصر تقلیدِ محض کے برعکس کسی تخلیق کار کا فکری تسلسل، اپنی تمام تر جذباتی، ذہنی، تاریخی اور تجزیاتی اسباب و علل کو بروئے کار لاتے ہوئے، چہار ابعادی[۳۷] زمانیت کے پیش منظر و پس منظر کے ادراک، انتخابِ عمل کے بالعموم اطوار کی دریافت اور اپنی داخلی فطرت کے اعتراف سے ایک مختلف و منفرد اظہار کے ساتھ انسلاکی ربط قائم کر لیتا ہے۔ انسلاکی ربط کی اس اساسیت میں تخلیق کار کا ایک مختلف و منفرد اظہار موجود ہوتا ہے۔ یہ اساسیت، تخلیق کار شعور و خرد مندی سے عبارت ہے۔ تخصیصی اعتبار سے بھی طبقۂ انساں میں محض باشعور و خرد مند افراد ہی قافلۂ حیات کو متعین

ولازم ذہنی وفکری اثاثوں کی جانب مائل کرتے ہیں اور اشخاص و اعمال کی اصلاح و ترمیم کی سعی کو ممکن العمل اور نافذ العمل کرتے ہیں۔ اسی لیے بادشاہان کے درباروں میں تخلیق کاروں کی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ مابعد جدیدیت کے اس دور میں جب فرد کو آزادیِ اظہار کا موقع ملا اور درباری وابستگی کا خاتمہ ہوا تو اقبالؔ، فیضؔ، راشدؔ، اور اکیسویں صدی کے آغاز میں عبد الرحمان بزمیؔ صاحب جیسے خرد مند تخلیق کار سامنے آتے ہیں؛ موخر الذکر کی تصنیف "حرف تمنا" اسی خرد مندی کا شعری اظہار ہے۔

آپ کے شعری رویوں اور رجحانات موجود اقبالؔ کے فکریات کی تعبیرات (Interpretations) آپ کو ظہورِ اغراض و ظہورِ صفات کا ہر دو مقام عطا کرتی ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ جیسا کہ ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب نے فرمایا کہ " معاشرہ اگر مشترک اقدار، مشترک روایات، مشترک تاریخ اور مشترک مقاصد کا حامل ہے تو وہ ایک اجتماعی مزاج یا اجتماعی احساسات سے مشخص ہو گا۔ ہم ایسے عناصر کے مجموعے یا 'کُل' کو 'قومیت' کہتے ہیں۔ اس طرح اگر معاشرہ یا معاشرتی احساسات کسی طرح ادب کا موضوع بنتے ہیں تو ان احساسات کا حامل ادب قومی ادب یا قومی شعور کا حامل ادب ہو گا۔ چناں چہ قومی شعور اور ادب ایک دوسرے سے الگ نہیں دیکھے جاسکتے۔ فرد کا ذاتی احساس بھی، جو تخلیقِ ادب کا محرک یا خود تخلیق کا محرک بنتا ہے، انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی، معاشرتی یا قومی ہوتا ہے، کیوں کہ فرد خلا کا باشندہ نہیں ہوتا اور نہ اس کا ادب خلا میں تخلیق ہوتا ہے۔ وہ اسی اپنے معاشرے یا قومیت سے وابستہ فرد ہے۔"[۳۸] بلاشبہ اقبالؔ کے عہد سے لے کر بزمیؔ صاحب کے عہد میں، اور آج بھی اقدارِ حیات کی مثبت فکری اور انسانی برتری، پیہم و مسلسل ہے۔

***

حوالہ جات و حواشی

۱ عبد الرحمان بزمیؔ صاحب نے اپنی پچاس سالہ شاعری کو ایک ڈائری میں جمع کر دیا تھا۔ نومبر ۲۰۰۵ء میں ان کے وصال کے بعد تین سال تک یہ ڈائری دستیاب نہ ہو سکی۔ مسلسل تلاش کے بعد ان کے کاغذات سے دستیاب ہونے پر آپ کی خواہش کے مطابق اس کی نقل ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کو بھجوائی گئی جنھوں نے حفیظ الرحمن احسنؔ کی مشاورت سے اس ڈائری کو نوک پلک سنوارنے کے عمل سے گزارنے کے بعد "حرفِ تمنا" کے نام سے شائع کیا۔ "حرف تمنا" آپ کا مجموعہ کلام ہے جس میں نعت رسول مقبول ﷺ، سلام، غزلیات اور اظہار تہنیت سمیت نہایت منتخب جواہر پارے شامل ہیں۔ جاوید اقبال خواجہ نے اس مجموعہ کو بزمیؔ صاحب سے وابستہ خوش گوار یادوں کو تازہ رکھنے کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے ("حرفِ تمنا"، ص ۲۳)۔ بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ جو آپ سے ملاقات اور ان کی زندگی میں ان کا مطالعہ کرنے سے محروم رہے، یہ کتاب یقیناً ان کے سامنے آپ کے خیالات، نظریات اور حب الوطنی کو پیش

کرنے میں کامیاب رہے گی۔

۲ عبدالرحمٰن بزمی، حرفِ تمنا، ص ۴۷

۳ ایضاً، ص ۵۱

۴ ایضاً، ص ۵۴

۵ فاروقی، شمس الرحمان، ۲۰۱۲ء، تعبیر کی شرح، ص الف، مشمولہ "دیباچہ طبع ثانی"، جامعہ نگر، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔

۶ عبدالرحمٰن بزمی، حرفِ تمنا، ص ۶۳

۷ ایضاً، ص ۶۵

۸ سومیگلی، لوکا، ۲۰۰۳ء، *Legitimizing the Artist: Manifesto Writing and European Modernism, 1885–1915*، ٹورنٹو یونیورسٹی پریس۔

۹ لیوس، پیریکلس، ۲۰۱۱ء، *The Cambridge Companion to European Modernism*، مشمولہ Eastern Europe از مارسی شور، ص ۲۲۵، کیمبرج یونیورسٹی پریس۔

۱۰ حرفِ تمنا، ص ۶۶

۱۱ نارنگ، گوپی چند، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، ۱۹۹۴ء، ص ۵۵، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز۔

۱۲ فاروقی، شمس الرحمان، ۲۰۰۷ء، خورشید کا سامان سفر، ص ۸۶، کراچی، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس۔

۱۳ عبدالرحمٰن بزمی، حرفِ تمنا، ص ۴۷

۱۴ نیر، ناصر عباس، ۲۰۱۶ء، اردو ادب کی تشکیل جدید، نوآبادیاتی اور پس نوآبادیاتی عہد کے اردو ادب کے مطالعات، ص ۳۰۷، کراچی، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس۔

۱۵ سعید، ایڈورڈ ڈبلیو، ۱۹۸۳ء، *The Worlrd, the Text and the Critic*، ص ۳۹، امریکا، ہارورڈ یونیورسٹی۔

۱۶ عبدالرحمٰن بزمی، حرفِ تمنا، ص ۸۰

۱۷ ایضاً، ص ۸۳

۱۸ ایضاً، ص ۱۲۹

۱۹ ایضاً، ص ۲۵۳

۲۰ فاروقی، شمس الرحمان، ۲۰۰۸ء، شعر شور انگیز، جلد چہارم، تیسرا ایڈیشن مع ترمیم و اضافہ، ص ۴۴، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔

۲۱ عبدالرحمٰن بزمی، حرفِ تمنا، ص ۱۱۶-۱۱۷

۲۲ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۹۵

۲۳ عبدالرحمٰن بزمی، حرفِ تمنا، ص ۱۱۸-۱۱۹

۲۴ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص ۶۳۰

۲۵ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص ۴۵۳

۲۶ "حرفِ تمنا"، ص ۱۴۰-۱۴۲

---

۲۷ عبدالرحمٰن بزمی، حرفِ تمنا، ص ۲۲۵

۲۸ کار، ای ایچ، ۱۹۹۴ء، بین الاقوامی تعلقات :دو عالمی جنگوں کے درمیان، (اشاعت چہارم، اولین اشاعت)، ترجمہ :م۔ر۔ حسان، کراچی، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی

۲۹ عارف، نجیبہ، ۲۰۱۱ء، "نائن الیون اور پاکستانی اردو افسانہ"، مشمولہ "پیش لفظ" از سید مظہر جمیل، ص ۹، اسلام آباد، پورب اکادمی۔

۳۰ گرانٹ، پی بی، ۲۰۲۰ء، Desire: Flaubert, Proust, Fitzgerald, Miller, Lana Del Rey, Breakthroughs in Mimetic Theory، امریکا، مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی پریس۔

۳۱ فاروقی، شمس الرحمان، ۲۰۰۶ء، تعبیر کی شرح، ص ۱۷۳، ۵۹، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔

۳۲ تصنیف مذکور، ص ۸۰

۳۳ "انتساب"، مشمولہ، سرِوادیِ سینا، فیضؔ

۳۴ عبدالرحمٰن بزمی، حرفِ تمنا، ص ۲۲۶

۳۵ ایضاً، ص ۱۷۳

۳۶ ایضاً، ص ۱۹۸

۳۷ چہار ابعادی زمانیت کی حقیقت کچھ یوں ہے کہ انیسویں صدی تک دنیا کا سہ ابعادی تصور رائج تھا۔ نئی تحقیقات نے ثابت کیا کہ اب چار ابعاد تسلیم کیے گئے ہیں کیوں کہ کائنات محض مقاموں اور نقطوں کا مجموعہ نہیں بلکہ واقعات پر مشتمل ہے کسی واقعے کے تعین کے لیے محض مقام کا تعین کافی نہیں، اب اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ واقعہ وقت کے کس حصے میں ظہور پذیر ہوا۔ (تفصیل کے لیے ؛ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، " اقبالؔ کا تصورِ زمان و مکان"، مشمولہ "زماں و مکاں"، مرتبہ، ڈاکٹر وحید عشرت، ص ۱۹۹۰، ۵۰۵ء، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز۔)

۳۸ عقیل، ڈاکٹر معین الدین، ۲۰۲۰ء، ہماری تعلیم اور ہماری جامعات: صورت حال اور تقاضے، لاہور، ادارۂ تعلیمی تحقیق۔